Sept
2026

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

اسوۂ رسول ﷺ

''رسول ﷺ آج چشم ظاہر سے مستور ہیں لیکن ''اسوۂ رسول'' مستور نہیں۔ وہ قدم، جن پر پیشانیوں کا رگڑنا ہمارے لیے اوج سعادت تھا، آج ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ''نقش قدم'' موجود ہیں۔ صاحب خُلق عظیم آج ''رفیق اعلیٰ'' کی رفاقت میں ہے لیکن ''خلق عظیم'' کی امانت انسانوں کے سینوں اور کتب خانوں کے سفینوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ پیام بر کا پیام زندہ ہے، کام زندہ ہے، نام زندہ ہے اور آج خاک کا ہر پتلا اپنے ظرف اور بساط کے مطابق، اس گنج نور سے کسب فیض کر سکتا ہے۔''

مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

عالم اسلام سے چند اہم گزارشات

مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

''عصر حاضر کے تناظر میں عالم اسلام کے لیے سب سے زیادہ ضروری ''دفاعی صنعت'' (Defence Industry) میں ترقی ہے، تاہم دیگر صنعتی میدانوں میں بھی کمالِ مہارت حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ ہم جن چیزوں کو بیرون ملک سے Import کرنے پر مجبور ہیں، ان کی صنعتیں ہم خود اپنے ملک میں قائم کرسکیں۔ خاص طور سے ''دفاعی صنعت'' (Defence Industry) میں غیر معمولی فنی کمال، باریک بینی اور ایسے اعلیٰ درجہ کی جدت ومہارت درکار ہے کہ وہ اپنے معیار اور کارکردگی میں دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صنعت سے کسی طرح کم نہ ہو بلکہ وہ ان سے بڑھ کر ہی ثابت ہو۔ آج ضرورت ہے ہوائی جہاز، بموں اور بھاری ٹینکوں کے بڑے بڑے کارخانے نجی طور پر بنانے کی اور اپنی فوجوں کو جدید ترین جنگی حکمت عملی کے مطابق ٹریننگ دینے کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے، پورے عالم اسلام میں پھیلی ہوئی بے شمار معدنی دولت، مخفی خزانے اور غیر معمولی قدرتی ذخائر کے ہوتے ہوئے، دوسروں کے سامنے کاسہ گدائی لے کر کھڑا ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسری اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے تجارتی اور صنعتی تعلقات مغربی ممالک کے بجائے مشرقی ممالک کے ساتھ استوار کرنے چاہئیں اور ان کے ساتھ اپنی مصنوعات اور اشیاء کا تبادلہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مغربی سامراج کے خلاف مشرق ہی ہمارا حلیف اور دوست ہے اور وہ بھی اس کے پنجہ جبر واستبداد سے نجات، غلامی کی زنجیروں سے خلاصی اور اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنے ملی وقومی تشخص کا تحفظ بھی چاہتا ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ ہم بڑی حد تک استعمار پسندوں کی سازشوں اور ان کی پس پردہ چالوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں اور ایسے نئے دوست بنا سکیں جو شاید ہمارے پرانے دشمنوں کی نسبت ہم سے زیادہ قریب اور ہمارے لیے ان سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں اور مغربی سامراج سے آزادی کی اس عظیم جدوجہد میں ہمیں ان کی تائید اور نصرت حاصل ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں مشرق کا اعتماد اور اس کی محبت حاصل ہو جائے اور عالم اسلام کے مشرق سے مضبوط تعلقات اور مستحکم روابط قائم ہو جائیں تو بلاشبہ اسلامی مشرق کے لیے یہ ایک نئے باب کا آغاز اور عظیم فتح ہوگی۔

اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ عالم اسلام کے حالات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک عوام حکومت سے ناراض اور حکومت عوام سے بدظن وبرہم رہے۔ اسی لیے ایسے اصحابِ دعوت وعزیمت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے جو پوری ہمت واستقلال کے ساتھ اصلاح وہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں لیکن اس کے لیے صحیح نیت اور عزم وحوصلہ شرط ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے میدان میں اخلاص کے ساتھ کام کرے، دوسروں کے حقوق ادا کرے، نہ کسی کی خوشنودی کا طالب ہو اور نہ کسی انسان سے اپنے لیے کلمات مدح وتحسین کا منتظر رہے بلکہ اس کا ہر عمل محض اللہ کی رضا کے لیے ہو اور وہ یقین رکھے کہ اللہ ہی اس کی محنت کا اجر دے گا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾

(جس نے اچھائی کی اس نے اپنے لیے کی اور جس نے برائی کی وہ اس کے سر۔)''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۸ — ستمبر ۲۰۲۶ء-ربیع الاول ۱۴۴۸ھ — شمارہ: ۹

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ."

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(بلا شبہ میں تو (اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے)

سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)

(الکامل لإبن عدی: ۱۰۴۹)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد مکی حسنی ندوی

محمد امین حسنی ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات'' مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

زمانہ آج بھی ہے جس کے در پر ناصیہ فرسا (اداریہ)...........۳

بلال عبدالحی حسنی ندوی...

نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک: ایک متروک سنت..........۴

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی...

تقویٰ کیا ہے؟...۷

بلال عبدالحی حسنی ندوی...

ثبوتِ نسب کے احکام...۹

مفتی راشد حسین ندوی...

مریم جمیلہ؛ یہودیت سے اسلام تک..........................۱۱

محمد مکی حسنی ندوی...

الحاد کا طوفان، اسباب اور علاج..............................۱۳

محمد نجم الدین ندوی...

ابتلاء وآزمائش میں اسوۂ نبوی ﷺ..........................۱۵

محمد امین حسنی ندوی...

امین حرم...۱۷

محمد مصعب ندوی...

رسول اللہ ﷺ اور انسان سازی کا فن........................۱۹

محمد ارمغان بدایونی ندوی...

عاشق ہوں دل وجاں سے...

حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

عاشق ہوں دل و جاں سے رسولِ عربیؐ کا
مکّی مدنی ہاشمی مُطّلبی کا

اے پاک نبیؐ تیری نظر نور سحر ہے
کافور ہوا جس سے فسوں تیرہ شبی کا

آنکھوں میں سبھی کے ہے تیرا حسن سراپا
ہے ذکر زبانوں پہ تری خوش لقبی کا

دنیا میں ترے نام کا شہرہ ہے ہر اک سمت
ہر ایک ہے شاہد تری عالی نسبی کا

ہر ذرّہ تری خاک کف پا کا گہر ہے
آقا ہے تو ہی ہر عجمی کا عربی کا

کرتا ہوں تری ذات پہ میں جان کو قرباں
ہے تجھ پہ فدا دل مری امّی وابی کا

مل جائے مجھے کوثر وتسنیم کا ساغر
ساقی سے تقاضا ہے مری تشنہ لبی کا

ہے تو ہی طبیبِ دل بیمار وہراساں
آیا ہوں لیے شوق میں درماں طلبی کا

ملتا ہے ترے در پہ بلالِ حبشیؓ کو
کیا کام ترے در پہ کسی بولہبی کا

گستاخ زباں جو بھی ہو خاموش رہے وہ
ہو ناس تری شان میں ہر بے ادبی کا

مسکن ہے ترا پاک سے پاکیزہ مدینہ
کیا کہنا ہے اس شہر کی شیریں رطبی کا

جس شہر کا ہر غنچہ وگل رشک چمن ہے
ہے درجہ بلند اس کے زن ومرد وصبی کا

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مدیر کے قلم سے

زمانہ آج بھی ہے جس کے در پر ناصیہ فرسا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تمام انسانیت کے لیے منتخب فرمایا، اس نے آپ ﷺ کو رہتی دنیا تک کے لیے نبی بنایا اور تمام نبیوں کا سردار وامام بنایا، مسجد اقصیٰ میں نبیوں کی امامت کا شرف عطا فرمایا، آپ ﷺ کو معراج پر بلایا، آپ ﷺ کو مقام محمود عطا کیا، حوض کوثر آپ کو ملا، شفاعت عظمیٰ آپ کو بخشی گئی اور اللہ نے آپ کو لاکھوں لاکھ لوگوں کی بخشش کا ذریعہ بنایا۔

اگر آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی جب دنیا تباہی کے بالکل کنارہ پر کھڑی تھی، گویا انسانیت کی سواری ڈھلوان پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے سب مسافر میٹھی نیند سو رہے تھے، انھیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کی سواری کدھر جا رہی ہے اور اس کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ ایک صحیح حدیث میں آتا ہے:

”إن اللہ نظر إلیٰ أهل الأرض فمقتهم عربهم وعجمهم إلا بقايا من أهل الكتاب.“ (صحیح مسلم: ۷۳۸۶)

(بلاشبہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین پر نگاہ فرمائی تو انتہائی ناراض ہوا، عربوں اور عجمیوں پر، سوائے کچھ اہل کتاب کے۔)

ممکن تھا کہ اس دنیا کے تباہ کرنے کا فیصلہ کر دیا جاتا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحم کھایا اور رحمۃ للعالمین ﷺ کو اس دنیا میں بھیجا تاکہ اس کی کل ٹھیک ہو اور یہ دنیا جو تباہی اور خود کشی پر آمادہ تھی اس کو بچایا جا سکے اور اس کو وہ مبارک زمانہ نصیب ہو جو دنیا بننے سے لے کر قیامت تک کا سب سے پر بہار زمانہ ہے، اللہ کا یہ فیصلہ تھا جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی بعثت ہوئی۔

سرکار دو عالم محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انسانوں کو انسان بنایا اور ان کو جینے کا سلیقہ عطا فرمایا، غلامی سے نکال کر آزادی بخشی، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت عطا فرمائی اور اس کو بعثت کے مقاصد میں شمار فرمایا، انسان جو اپنی عادتوں اور رسموں کا غلام بن گیا تھا اور اس کی تنگی میں گھٹن محسوس کر رہا تھا اس کو انسانیت کی بلندی اور کشادگی عطا فرمائی۔

یہ آپ ﷺ کا فیض رحمت ہی تو تھا کہ وہ دنیا جو جہالت کی اندھیریوں میں بھٹک رہی تھی اس کو آپ ﷺ نے علم کی روشنی دی اور اس روشنی میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اہل انصاف اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ دنیا کی موجودہ ترقیات مسلمانوں کے جستجوئے علم پر قائم ہیں، یہ آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا صدقہ ہے کہ دنیا عدل وانصاف سے بھر گئی، جہاں ہر طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا وہاں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ ایک کمزور خاتون ساز وسامان کے ساتھ سیکڑوں میل کا سفر کرتی ہے اور کوئی اس کی طرف غلط نگاہ ڈالنے والا نہیں ہوتا۔

آج دنیا آپ ﷺ کی سراپا رحمت تعلیمات اور اس اسوۂ زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت مند ہے جو دنیا کے لیے نجات کا تنہا ذریعہ ہے اور ہر انسان کے لیے روشنی کا مینار ہے، آج یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ آپ ﷺ کسی قوم یا کسی ملک کے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہیں، انسان دشمن طاقتوں نے اور علم دشمن مصنفوں نے جس طرح تاریخ مسخ کی ہے اور رحمت عالم ﷺ کی سیرت کو جس غلط انداز میں پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں آج ان جہالتوں کا پردہ فاش کرنے ضرورت ہے تاکہ دنیا میں لگی ہوئی آگ کو بجھایا جا سکے اور انسانوں کو ان کے درد کا درماں اور زخم کا مرہم مل سکے۔ یہ ماہِ مبارک یہی پیغام دیتا ہے کہ ہمیں اسی اسوۂ رحمت کو عام کرنا ہے اور اس کی ضرورت سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک: ایک متروک سنت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو قیامت تک آنے والی پوری انسانیت کے لیے کامل نمونہ بنایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (یقیناً تمہارے لیے رسولؐ اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو امت کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ آپ ﷺ کی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، لباس، نشست و برخاست اور ظاہری ہیئت، سب اتباع کے لائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف آپ ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کیا بلکہ آپ ﷺ کے حلیہ مبارک، لباس اور موئے مبارک کی کیفیت تک کو بڑی محبت اور اہتمام سے روایت کیا۔

اگر موئے نبویؐ کی کیفیت محض ایک غیر اہم تاریخی بات ہوتی تو محدثین اسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور شمائل ترمذی میں مستقل ابواب کے تحت محفوظ نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہر ادا اہلِ ایمان کے لیے محبت، اقتدا اور اتباع کا عنوان ہے۔

افسوس کہ آج بہت سی سنتیں خصوصاً ظاہری ہیئت سے متعلق سنتیں عملی زندگی سے تقریباً غائب ہو چکی ہیں۔ انہی میں موئے نبویؐ کی سنت بھی شامل ہے جس پر اہلِ علم کے حلقوں میں بھی عمومی توجہ کم نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں اسی سنت کا جائزہ احادیث کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"إن رسول الله ﷺ كان يضرب شعره منكبيه"
(آپ ﷺ کے بال مبارک شانہ ہائے مبارک تک پہنچ جاتے تھے۔)

(صحیح البخاری، کتاب اللباس: ۵۹۰۳)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كان النبي ﷺ مربوعاً، بعيداً مابين المنكبين، له شعر بلغ شحمة أذنيه." (البخاری، کتاب المناقب: ۳۵۵۱)

(نبی کریم ﷺ درمیانہ قد کے، دونوں کندھوں کے درمیان کشادگی تھی اور آپؐ کے بال مبارک کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"كان شعر رسول الله ﷺ إلىٰ أنصاف أذنيه."

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل: ۲۳۳۸)

(رسول اللہ ﷺ کے مبارک بال کانوں کے درمیانی حصے (آدھے کان) تک تھے۔)

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: "آپ ﷺ کے بال مبارک جُمّہ سے کچھ زیادہ اور وَفرہ سے کچھ کم تھے۔ آپ کی جمہ (بالوں کی لمبائی) کانوں کی لو تک پہنچتی تھی اور جب بال زیادہ لمبے ہو جاتے تو آپ ﷺ انہیں چار چوٹیوں (لٹوں) میں تقسیم کر لیتے تھے۔" (زاد المعاد: ۱/۱۷۰)

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بال مختلف اوقات میں مختلف لمبائی کے ہوتے تھے جس کی وجہ سے بظاہر مختلف روایات وارد ہوئی ہیں۔ (ابوداود: ۴۱۸۷)

علامہ مناویؒ لکھتے ہیں: "قال أبو شامة: وقد دلت صحاح الأخبار علىٰ أن شعره إلىٰ أنصاف أذنيه، وفي رواية يبلغ شحمة أذنيه، وفي أخرىٰ بين أذنيه وعاتقه، وفي أخرىٰ يضرب منكبيه، ولم يبلغنا في طوله أكثر من ذلك، وهذا الإختلاف باعتبار اختلاف أحواله، فروي في هذه الأحوال المتعددة بعد ما كان حلقه في حج أو عمرة" (فیض القدیر: ۵/۷۴)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ان روایات میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "وما دل عليه الحديث من كون شعره ﷺ كان إلىٰ قرب منكبيه كان غالب أحواله،

وكان ربما طال حتى يصير ذؤابة، ويتخذ منه عقائص وضفائر، وهذا محمول على الحال التي يبعد عهده بتعهد شعره فيها، وهي حالة الشغل بالسفر ونحوه."

(فتح الباری، کتاب اللباس: ۱۰/ ۳۶۰)

ان روایات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ یہ مختلف اوقات کی کیفیت کا بیان ہے۔ جب بال بڑھ جاتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے اور جب نسبتاً چھوٹے ہوتے تو نصف کان یا کانوں کی لو تک رہتے تھے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیشہ ایک ہی لمبائی کے بال نہیں رکھے بلکہ کبھی نصف کان تک، کبھی کانوں کی لو تک اور جب بال بڑھ جاتے تو شانہ مبارک تک پہنچ جاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف بال رکھنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان کی دیکھ بھال کا بھی حکم فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے بال ہوں وہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔

(أبی داود، کتاب الترجل: ٤١٦٣)

ملا علی قاریؒ مرقاۃ المفاتیح میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بالوں کو صاف رکھے، ان میں تیل لگائے، کنگھی کرے اور انہیں پراگندہ نہ چھوڑے۔" (مرقاۃ: ۷/ ۲۸۲۷)

یہ تصریحات اس بات کی دلیل ہیں کہ شریعت نے بال رکھنے کو بے مقصد یا محض ایک وقتی عادت قرار نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ آداب بھی بیان کیے ہیں۔

ابوبکر ابن العربی نے "الموھب اللدنية" میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے صرف صلح حدیبیہ، عمرۂ قضاء اور حجۃ الوداع کے موقع پر حلق کرایا اور صرف ایک بار قصر کرایا جیسا کہ صحیحین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے: "لم يحلق النبي ﷺ في سني الهجرة إلا عام الحديبية وعمرة القضاء وحجة الوداع ولم يقصر شعره إلا مرة واحدة كما في الصحيحين" (ص: ۱۰٤)

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ موئے نبویؐ صرف ایک تاریخی تذکرہ نہیں بلکہ سنت نبوی کا حصہ ہیں اور ان کی رعایت محبت رسول ﷺ کا ایک مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور فقہاء نے اس عمل کو آپ ﷺ کی سنت عادیہ میں شمار کیا ہے جس پر محبت رسول اور اتباع سنت کی نیت سے عمل کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے۔

(الموسوعة الفقهية الكويتية: ٢٦/ ٢٥٢)

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ چونکہ بال رکھنا عرب معاشرے کا رواج تھا، اس لیے اس کی اتباع مطلوب نہیں۔ یہ بات جزوی طور پر درست ضرور ہے کہ یہ آپ ﷺ کی سنت عادیہ میں سے ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کی کوئی دینی اہمیت ہی نہیں، صحیح نہیں۔

یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ علماء کرام صرف علم کے حامل نہیں بلکہ امت کے مقتدا بھی ہیں۔ عام مسلمان بہت سے دینی اعمال میں علماء کو دیکھ کر عمل کرتے ہیں۔ اگر علماء کسی سنت کا اہتمام کریں تو اس کا اثر معاشرہ پر بھی پڑتا ہے اور اگر کسی سنت کی طرف عملی توجہ کم ہو جائے تو عوام میں بھی اس کا ذوق کمزور پڑ جاتا ہے۔

یہاں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینی چاہیے کہ بال رکھنا فرض یا واجب نہیں، نہ ہی اس کے ترک پر کسی عالم یا مسلمان کو مورد ملامت ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کسی عمل کا استحباب احادیث سے ثابت ہو اور اس پر عمل کرنا آسان بھی ہو تو خصوصاً اہل علم سے اس کے اہتمام کی توقع بجا ہے، کیونکہ ان کی عملی زندگی خود دعوتِ دین کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتی ہے۔

ہمارے مدارس اور دینی حلقوں میں اکابر امت سے محبت کا جذبہ قابل تحسین ہے۔ اسی محبت کی بنا پر مخصوص لباس مثلاً: ٹوپی، کرتا، پائجامہ اور دیگر ظاہری شعائر کا اہتمام کیا جاتا ہے جو اپنی جگہ ایک اچھی روایت ہے، البتہ یہاں ایک علمی سوال پیدا ہوتا ہے:

اگر اکابر کی نسبت سے اختیار کیے گئے بعض طریقوں کا اس درجہ اہتمام ہو سکتا ہے تو کیا رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک سے متعلق صحیح احادیث میں ثابت سنت اس سے زیادہ توجہ کی مستحق نہیں؟

یہ سوال کسی شخصیت یا ادارے پر تنقید نہیں بلکہ ترجیحات پر غور

کرنے کی دعوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تمام اکابر کی عظمت کا راز ہی اتباع رسول ﷺ تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی عادت یا طرز عمل کو سنت نبویؐ پر مقدم نہیں کیا، لہٰذا اگر ہم ان سے سچی محبت رکھتے ہیں تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سنت رسول ﷺ کو اپنی عملی زندگی میں زیادہ سے زیادہ زندہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا عادات سے، مؤمن کے لیے باعث محبت اور موجب سعادت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا نمایاں وصف یہی تھا کہ وہ آپ ﷺ کی چھوٹی سے چھوٹی ادا کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس باب میں خاص طور پر معروف ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں متعدد روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے آثار اور عادات کی پیروی میں غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے حتی کہ جن مقامات پر آپ ﷺ نے قیام فرمایا وہاں قیام کرتے اور جن راستوں سے آپ ﷺ گزرے انہی راستوں سے گزرنے کی کوشش کرتے تھے۔ (فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ: ۱/ ۵۶۷، رقم: ۴۸۳)

اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک محبت رسول ﷺ کا تقاضا صرف واجبات کی ادائیگی نہیں بلکہ حتی الامکان آپ ﷺ کی ہر ادا سے وابستگی بھی تھا۔

اسی جذبہ اتباع کی بنیاد پر محدثین نے رسول اللہ ﷺ کے شمائل، لباس، نعلین، عصا، خوشبو، انگشتری اور موئے مبارک تک کو مستقل ابواب میں جمع کیا۔ اگر یہ امور دینی اعتبار سے بالکل غیر اہم ہوتے تو ان کی یہ غیر معمولی علمی خدمت کبھی وجود میں نہ آتی۔ یہ کہنا درست نہیں کہ جس نے موئے نبویؐ نہ رکھے وہ سنت کا تارک یا قابل ملامت ہے کیونکہ فقہاء نے اس عمل کو مستحب قرار دیا ہے، نہ کہ فرض یا واجب لیکن اتنی بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس سنت پر عمل کرنا آسان ہو اور جو صحیح احادیث سے ثابت ہو، اس کے احیاء کی کوشش خصوصاً اہل علم کی ذمہ داری ہے۔

اہل مدارس اور علماء کرام امت کے مقتدا ہیں۔ ان کے افعال سے عوام کے رجحانات بنتے ہیں۔ اگر وہ اپنی استطاعت کے مطابق سنت نبویؐ کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں تو معاشرہ میں سنتوں کے احیاء کا ایک نیا ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جو اس سنت پر عمل نہ کرے اس پر نکیر کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سنت کو سنت سمجھا جائے، اس کی قدر کی جائے اور اس پر عمل کرنے والوں کو اجنبی نہ سمجھا جائے۔

اس سلسلے میں ایک اہم دعوتی پہلو یہ بھی ہے کہ سنت کا احیاء صرف انفرادی عمل کا نام نہیں بلکہ یہ معاشرہ کے دینی مزاج کی تشکیل کا ذریعہ بھی ہے۔ جب اہل علم اور دینی شخصیات سنتوں کو اپنی عملی زندگی میں زندہ رکھتے ہیں تو عوام کے اندر ان کی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہے اور وہ سنت کو محض کتابوں میں مذکور ایک تاریخی عمل نہیں بلکہ زندہ دینی روایت کے طور پر دیکھنے لگتے ہیں۔ خصوصاً وہ سنتیں جو ترکِ واجب یا ترکِ فرض سے متعلق نہیں بلکہ محبت، اتباع اور حسن اقتدا کے دائرہ میں آتی ہیں؛ انہیں حکمت و نرمی کے ساتھ عام کرنا ایک مؤثر دعوتی ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سنتوں کے احیاء کو باہمی نزاع، طعن و تشنیع یا افضلیت کے دعوے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ محبت رسول ﷺ کو بنیاد بنا کر لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی بھی ثابت شدہ پہلو ہمارے لیے بے معنی نہیں۔ ایک سنت کا احیاء بسا اوقات کئی دوسری سنتوں کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے اور یوں محبت رسول ﷺ محض جذباتی وابستگی کے بجائے عملی اتباع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی محبت ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور سچی محبت کا سب سے روشن ثبوت اتباع ہے، لہٰذا موئے نبویؐ کی سنت کو بھی اسی زاویہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نہ اسے دین کا معیار بنایا جائے، نہ اسے بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کیا جائے بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کی ایک ثابت شدہ سنت سمجھتے ہوئے اس کی قدر کی جائے اور جو اہل علم اور مسلمان محبت رسول ﷺ کے جذبہ سے اس پر عمل کرنا چاہیں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے اور یہی اکابر امت کے منہج کے بھی مطابق ہے۔ (ترتیب: محمد نصر اللہ ندوی)

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

موجودہ دور کا ایک عام فتنہ:

دنیا میں علوم کے ماہرین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر فن کے الگ ماہرین ہوتے ہیں، اسی طرح مسئلہ ہے علم دین کا کہ جس آدمی نے اس کے لیے اپنی پوری زندگی لگائی اور اس نے باریکیاں سمجھیں، وہ اصول کو جانتا ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کل لوگ اصول بھی نہیں جانتے، بس اتنا سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں آیا ہے، اگر کوئی ان سے پوچھے کہ قرآن کی ایک آیت کو تم نے کس طرح سمجھا؟ کیا تم صرف ترجمہ پڑھ کر فیصلہ کرنا چاہتے ہو؟ ظاہر ہے صرف قرآن یا حدیث کا ترجمہ پڑھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، جیسے کہ آج دانشور طبقہ جب دین کی طرف آتا ہے تو اس سے اکثر یہ غلطی ہوتی ہے کہ ترجمہ پڑھ کر خود فیصلے شروع کردیتے ہیں۔ وہ علماء سے رجوع کرنے کے بجائے کہتے ہیں کہ ہم قرآن وحدیث پر عمل کر رہے ہیں، حالانکہ نہ وہ قرآن سے واقف ہوتے ہیں، نہ حدیث سے، ترجمہ والی سیکنڈ ہینڈ معلومات ایسی نہیں ہوتی ہیں کہ ان کی بنیادوں پر فیصلے کیے جائیں بلکہ یہ فیصلے انھی لوگوں کو کرنے کا حق ہے جن کی معلومات فرسٹ ہینڈ ہوتی ہیں اور براہ راست مطالعہ ہوتا ہے پھر تمام بنیادوں اور اصولوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہی حال ہوتا ہے کہ آدمی کچھ کا کچھ مفہوم سمجھ لیتا ہے، قصہ مشہور ہے کہ ایک صاحب کا معمول تھا وہ ہر استنجا کے بعد وتر پڑھا کرتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ ہر استنجا کے بعد وتر کیوں پڑھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو حدیث کا حکم ہے مگر لوگ اس پر عمل نہیں کرتے پھر جب لوگوں نے حدیث پوچھی تو انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث سنائی: ''من استجمر فلیوتر'' (جو استنجا کرے اس کو چاہیے کہ وہ وتر کرے۔)

ظاہر بات ہے کہ اس حدیث میں ''وتر'' کا ترجمہ بالکل الگ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو آدمی ڈھیلے سے استنجا کرے اس کو چاہیے کہ وہ طاق عدد استعمال کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دانشور طبقہ کے پاس سیکنڈ ہینڈ معلومات ہیں، ترجمہ پڑھ کر یہ سمجھنا کہ ہم کو عربی آگئی اور اب ہم قرآن مجید کا فہم بھی حاصل کرچکے، ظاہر ہے غلط بات ہے۔ قرآن مجید کے علم کی کئی پرتیں ہیں، اگر ان میں آدمی گھستا چلا جائے تو اس کی عمر ختم ہوجائے، اس کی ذہانت ختم ہوجائے اور اس کا علم بھی ختم ہوجائے لیکن قرآن مجید کی پرتیں ختم نہیں ہوں گی، اب اگر کوئی اس کی پہلی پرت تک پہنچ جاتا ہے اور اس کو قرآن فہمی کا دعویٰ ہوجائے تو ظاہر ہے بالکل غلط ہے اور یہ اس زمانہ کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ ہے۔

موجودہ دور میں اگر کسی آدمی کو تھوڑی سی عربی آجائے اور وہ قرآن پڑھ لے تو سمجھ لیتا ہے کہ ہم نے پورا دین سمجھ لیا، صرف تنہا قرآن مجید پورا دین نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دین کی اصل اول قرآن مجید ہے اور اصل ثانی حدیث وسیرت اور سنت رسول ﷺ ہے، جب ان ساری چیزوں میں آدمی مہارت پیدا کرلے تب یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہاں! اس کو کسی قدر فہم حاصل ہے لیکن پھر بھی اس کو بولنے کا حق نہیں، اس لیے کہ یہ حق اصلاً ان مجتہدین فن کو حاصل تھا جنھوں نے غیر معمولی محنت کی، تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر ان کو پڑھا جائے تو عقلیں دنگ رہ جائیں۔

موجودہ دور کا یہ ایک فتنہ ہے کہ ہر آدمی فتویٰ دے رہا ہے اور دین کے سلسلہ میں رائے زنی کر رہا ہے کہ ارے یہ مولوی کیا جانیں جو دین کے بارے میں فتویٰ دے دیتے ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حق انھی کو حاصل ہے، انھوں نے اس کے لیے اپنی عمروں کو کھپایا ہے، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے متعلق آتا ہے کہ یہ حضرات رات رات بھر جاگتے تھے، جب نیند آتی تو کبھی ٹب میں پانی بھر کر بیٹھ جاتے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! صحت خراب ہوجائے گی، فرمایا: میں اس خیال سے جاگتا ہوں اور مسائل کا استنباط کرتا ہوں کہ امت اس امید میں ہے

کہ محمد جاگ رہے ہوں گے اور کل صبح ان سے مسئلہ پوچھ لیں گے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں جانا ہوا، انھوں نے ان کے لیے رات میں تہجد کے لیے پہلے سے پانی کا انتظام کر دیا لیکن جب فجر کے وقت وہ ان کے کمرہ گئے تو دیکھا کہ لوٹا بھرا رکھا ہے اور نماز کا وقت بھی قریب ہے، انھوں نے نماز کے لیے بلایا تو امام شافعی بستر سے اٹھے اور نماز کو چل دیے پھر فجر کی نماز بھی پڑھائی، یہ دیکھ کر امام احمد بن حنبل کو مزید تعجب ہوا، نماز کے بعد امام شافعی نے خود فرمایا کہ رات عجیب قصہ پیش آیا، میں جیسے ہی بستر پر لیٹا تو میرے ذہن میں ایک حدیث آئی، میں نے اس پر غور کرنا شروع کیا اور اس سے مسائل کا استنباط کیا تو میں نے سو مسئلے نکالے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ اندازہ ہوا کہ وہ تو رات بھر دین کی ایک بڑی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بلاشبہ ان حضرات نے اپنے آپ کو دین کے لیے پوری طرح قربان کیا تھا اور ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ دین کے سلسلہ میں کوئی بات کہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ آج بھی یہ دروازہ بند نہیں ہے، جو شخص بھی ویسی محنت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو وہ ذہانت دے گا، وہ علم میں غوطے لگائے گا اور قرآن وحدیث میں وہ عبور کامل حاصل کرے گا پھر پوری احتیاط کے ساتھ وہ آگے بڑھے گا تو اللہ اس کو مقام عطا فرمائیں گے۔

اس دور میں اللہ کے کس بندہ سے یہ امید کی جائے کہ وہ امام ابوحنیفہ یا امام شافعی بن جائے گا، آج حال یہ ہے کہ ہر جگہ سود کا غبار موجود ہے، حدیث میں بھی آتا ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا جس میں آدمی اگر سود سے بچ بھی جائے تو اس کے غبار سے نہیں بچے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ فتنوں کا دور ہے اور اسی کی وجہ سے لوگ مصیبت میں پڑ گئے۔

حاصل یہ کہ دین کے بارے میں بغیر کسی تحقیق کے کوئی بات کہہ دینا انتہائی غلط بات ہے اور اللہ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی، اگر آج کے نئے لوگ دین کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں تو اس سے بڑی حماقت نہیں اور جو ان کے پیچھے چلیں تو ان سے بڑا کوئی احمق نہیں، کوئی وکیل کے پاس جا کر کہے کہ مجھے تیز بخار ہے، تم کوئی دوا بتا دو تو لوگ اس کو پاگل ہی سمجھیں گے اور کہیں گے کہ پہلے اس کا پاگل خانہ میں علاج کراؤ پھر دوا خانے لے جاؤ۔ یہی حال دین کے معاملہ میں بھی ہے، اگر کوئی عام آدمی کسی دانشور کے پاس جا کر مسئلہ پوچھا، یا نیٹ پر کوئی آدمی بہت اچھی بات کہہ دے اور وہ اس کو سمجھے کہ انھوں نے تو ایسی نئی بات کہی جو آج تک کسی نے نہیں کی، یاد رکھیں! اصل دین وہی ہے جو بتایا جا چکا، نیا دین کچھ نہیں ہے، دین میں نئی بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بدعت ہے، اگر کوئی چیز کتاب وسنت میں موجود ہے تو وہ قدیم ہے اور اگر موجود نہیں ہے پھر بھی کوئی بتاتا ہے تو ظاہر ہے وہ بدعت ہے۔

ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں سے بچا جائے اور جو ایسے لوگ ہیں وہ خود بھی اپنی اصلاح کریں، جنھوں نے دین کے لیے اپنی زندگیاں نہیں کھپائیں، جن کو شاید دین پر عمل کرنے کی توفیق بھی پوری طرح نہیں ہوئی، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے دین کا فہم حاصل کرنے میں قرآن مجید پڑھنا ہی کافی ہے، جب کہ خود قرآن مجید میں بے شمار مواقع پر یہ بات کہی گئی کہ

﴿مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَن تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظاً﴾ (النساء: ۸۰)

(جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو پھر گیا تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔)

فہم قرآن کے ساتھ فہم حدیث اور اللہ کے رسول ﷺ کی سچی اتباع بھی نہایت ضروری ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے خود یہ بات ارشاد فرمائی کہ قرآن سخت ودشوار ہے اس شخص کے لیے جو اس کو پسند نہ کرے اور اس شخص کے لیے آسان ہے جو اس کی اتباع کرے اور جو میری حدیث سنے گا اس کو محفوظ رکھے گا اور اس کے مطابق عمل کرے گا وہ قیامت میں قرآن مجید کے ساتھ آئے گا اور جس نے میری حدیث کی بے وقعتی کی اس نے قرآن کی بے وقعتی کی اور جس نے قرآن کی بے وقعتی کی اس نے دنیا وآخرت میں نقصان اٹھایا۔"

ثبوت نسب کے احکام

مفتی راشد حسین ندوی

مطلقہ مدخولہ کے بچہ کے نسب کا ثبوت:

اگر شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی یا طلاق بائن دی اور طلاق کے بعد چھ مہینے سے پہلے اس کے بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا اور بچہ کی ولادت سے اس کی عدت پوری ہوجائے گی اور اگر مطلقہ رجعیہ یا بائنہ کے طلاق کے بعد دو سال سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو تو اس کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا اور اس کی ولادت سے عدت پوری ہوجائے گی، اس لیے کہ حمل کی اکثر مدت دو سال ہے لہٰذا مانا جائے گا کہ طلاق کے وقت وہ حمل سے تھی اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہوتی ہے۔ (ہدایہ مع الفتح:۴/۱۷۲، ہندیہ:۱/۵۳۷)

اور اگر بچہ کی پیدائش طلاق رجعی کے دو سال یا اس کے بعد ہوئی تو اگر عورت نے عدت گزر جانے کا اقرار نہیں کیا تھا تو یہ بچہ شوہر ہی کا سمجھا جائے گا اور مانا یہ جائے گا کہ شوہر نے اپنی بیوی سے رجوع کرلیا ہوگا۔ (ہدایہ مع الفتح:۴/۱۷۲)

اور اگر بچہ کی پیدائش طلاق بائن کے دو سال یا اس سے زیادہ کے بعد ہوئی تو اس کا نسب شوہر سے ثابت نہیں ہوگا، الا یہ کہ شوہر اس کا دعویٰ کرے تو مانا یہ جائے گا کہ وطی بالشبہ کی وجہ سے حمل ٹھہر گیا ہوگا۔ (ہدایہ مع الفتح:۴/۱۷۳)

ثبوت نسب کی لازمی شرط:

اوپر کچھ جگہیں بتائی گئیں جن میں مطلقہ رجعیہ اور مطلقہ بائنہ سے پیدا ہونے والے بچہ کا نسب شوہر سے ثابت ہوجاتا ہے لیکن اس کے لیے ایک ضروری شرط پر دھیان دینا بھی ضروری ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ بچہ کا نسب شوہر سے اسی وقت ثابت ہوگا جب شوہر یا تو بیوی کے حاملہ ہونے کا اقرار کرے، یا اس پر گواہی پائی جائے کہ بچہ اسی عورت سے پیدا ہوا ہے، یا اس عورت کا حمل ظاہر ہو، ان تین شکلوں میں سے کوئی شکل بھی نہ پائی جائے تو نسب ثابت نہیں ہوگا۔
(درمختار ورد المحتار شامی:۳/۵۴۵)

جب عدت وفات میں ولادت ہو:

اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے اور انتقال کے چھ مہینے کے اندر اندر اس کے بچہ کی پیدائش ہو تو اس بچہ کا نسب شوہر سے ثابت ہوجائے گا اور اگر چھ مہینے پورے ہونے کے بعد شوہر کی وفات سے دو سال کے اندر اندر بچہ پیدا ہوا اور اس معتدہ نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو تو اس بچہ کا نسب بھی شوہر سے ثابت ہوجائے گا اور اگر عدت پوری ہوجانے کا اقرار کرلیا لیکن اقرار کرنے کے چھ مہینے کے اندر اندر بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب بھی شوہر سے ثابت ہوجائے گا اور اگر عدت گذرنے کا اقرار کرنے کے چھ مہینے بعد یا شوہر کی وفات سے دو سال بعد بچہ پیدا ہوا تو بچہ کا نسب شوہر سے ثابت نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ جیسے مطلقہ کے بچہ کے ثبوت نسب کے لیے گواہی کا پایا جانا یا حمل کا ظاہر ہونا لازمی شرط ہے، معتدہ وفات کے لیے بھی شرط ہے۔ (ہدایہ:۴/۱۷۵-۱۷۶، ہندیہ:۱/۵۳۷)

نکاح فاسد اور وطی بالشبہ کے بعد پیدا ہونے والے بچہ کے نسب کا ثبوت:

اگر نکاح کی شرائط میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے مثلاً: دو گواہ نہ ہوں یا گواہوں میں سے کوئی ایک غیر مسلم ہو، یا عورت محرمات میں سے ہو تو یہ نکاح فاسد ہوتا ہے، شوہر پر لازم ہے کہ اس طرح کا نکاح ہو تو متارکت کرے یعنی کہہ دے کہ میں نے تم کو چھوڑ دیا یا قاضی نکاح ختم کردے۔ (شامی:۳/۱۳۱-۱۳۳)

بہر حال جب نکاح فاسد ہوجائے اور شوہر عورت سے وطی کر

لے تو وطی کے دن سے چھ مہینے کے بعد اور دو سال کے اندر جو بچہ پیدا ہوگا اس کا نسب اس شخص سے ثابت ہوجائے گا خواہ وہ دعویٰ کرے یا نہ کرے۔ (شامی: ۳/۱۳۴، ہندیہ: ۱/۳۳۰)

رہی وہ صورت جب وطی بالشبہ ہوجائے یعنی کسی عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر اس سے وطی کر لی مثلاً: دھوکہ سے بجائے بیوی کے کسی اور کو رخصت کرا دیا گیا تو اگر اس عورت کے بچہ پیدا ہوا اور وطی کرنے والا اس کو اپنا بچہ قرار دے تو اس کا دعویٰ مان لیا جائے گا، دعویٰ نہ کرے تو اس کا بچہ نہیں مانا جائے گا۔ (البحر الرائق: ۴/۱۷۲)

مشرک سے نکاح کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب:

اگر کوئی مسلمان کسی مشرک جیسے ہندو یا پارسی یا دہریہ عورت سے نکاح کرلے تو یہ نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا اور اگر بچہ پیدا ہوجائے تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا اور اگر عیسائی یا یہودی عورت سے نکاح کیا تو نکاح منعقد ہوجائے گا اور نسب بھی ثابت ہوجائے گا۔ (شامی: ۳/ ۲۸)

اگر مسلمان عورت کسی بھی طرح کے کافر سے شادی کرلے تو نکاح منعقد نہیں ہوگا خواہ وہ یہودی یا عیسائی ہو، یا ہندو، پارسی اور ملحد وغیرہ ہو اور اگر شادی کے نتیجہ میں بچہ پیدا ہو تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔ (شامی: ۳/ ۵۵۵)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی مختلف شکلیں اور ان کے احکام:

آج کے دور میں میڈیکل سائنس نے کافی ترقی کر لی ہے چنانچہ جن مردوں اور عورتوں کے اولاد نہیں ہوتی ہے، ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اللہ کے حکم سے ان کے اولاد ہوجاتی ہے، اس کی کئی شکلیں ہیں اور سب کے الگ الگ احکام ہیں، ہم ذیل میں بعض شکلیں اور ان کے احکام درج کر رہے ہیں:

۱- ایک طریقہ یہ ہے کہ شوہر کی منی اور اس کی بیوی کے بیضہ کو لے کر خارجی ٹیوب میں رکھ کر افزائش کی جاتی ہے پھر کچھ وقت کے بعد اس مجموعہ کو بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے پھر وہیں سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس شکل کو اکثر علماء نے ضرورت کے وقت جائز قرار دیا ہے۔ (فتویٰ دار الافتاء جامعۃ الرشید: ۵۷۷۶)

اور اس کے نتیجہ میں جو بچہ پیدا ہوگا اس کا نسب شوہر ہی سے ثابت ہوگا، اس لیے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اولاد کو جو مائیں جنتی ہیں وہی اس کی ماں ہوتی ہیں؛ ﴿إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ﴾

پیچھے گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بچہ صاحب فراش کا ہوتا ہے یعنی شوہر کا؛ "الولد للفراش" (بچہ فراش کا ہوتا ہے۔) (بخاری: ۲۰۵۳، مسلم: ۱۴۵۷)

۲- اگر شوہر اپنے نطفہ اور دوسری اجنبیہ عورت کے بیضہ کو ٹیوب میں رکھ کر اس کو بارآور کرائے اور پھر ایک مدت کے بعد اسے اپنی بیوی کے رحم میں منتقل کروا دے پھر وہیں سے بچہ کی پیدائش ہو تو شرعاً یہ عمل حرام ہے لیکن اس بچہ کا نسب بھی "الولد للفراش" (بچہ فراش کا ہوتا ہے) سے ثابت ہوجائے گا، اس لیے کہ بچہ کو جس نے جنا ہے قرآن کے حکم کے مطابق وہی اس کی ماں ہے: ﴿إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ﴾

۳- اگر شوہر کے علاوہ دوسرے شخص کے نطفہ کو اپنی بیوی کے بیضہ میں رکھ کر ٹیوب میں بارآور کرائے پھر بیوی کے رحم میں منتقل کرا دے اور بیوی ہی بچہ کو جنے تو اوپر بیان کردہ دلائل کی وجہ سے اس بچہ کا نسب بھی انھی میاں بیوی سے ثابت ہوجائے گا لیکن اس طرح کرانا حرام ہے اور زنا کاری سے مشابہ ہے۔

۴- اگر شوہر کے نطفہ اور بیوی کے بیضہ کو ٹیوب میں بارآور کرا کے کسی غیر عورت کے رحم میں رکھا اور غیر عورت ہی نے اس کو جنم دیا تو اس کا نسب ان میاں بیوی سے ثابت نہیں ہوگا اور وہ عورت اگر شادی شدہ ہے تو بچہ کا نسب اس عورت کے شوہر سے ثابت ہوگا اور شادی شدہ نہیں ہے تو بچہ صرف اس عورت کی طرف منسوب ہوگا جیسے زنا میں ہوتا ہے اور ایسا عمل کرنا شرعاً حرام ہوگا۔

۵- اگر غیر مرد کا نطفہ اور غیر منکوحہ کا بیضہ ٹیوب میں بارآور کرایا پھر منکوحہ کے رحم میں ڈالا تو یہ ایک طرح کا زنا ہوگا، البتہ بچہ کا نسب شوہر ہی سے ثابت ہوجائے گا۔

مریم جمیلہ
یہودیت سے اسلام تک

سید محمد مکی حسنی ندوی

مریم جمیلہ کا نام ان خواتین میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جنہوں نے جدید مغربی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اسلام کے مطالعہ کے ذریعہ اپنی فکری اور روحانی زندگی کو ایک نئی سمت دی۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ حق کی تلاش اگر اخلاص، دیانت اور علمی جستجو کے ساتھ کی جائے تو انسان اپنے ماحول، معاشرتی دباؤ اور سابقہ تصورات سے بلند ہو کر حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ ان کا اسلام کی طرف سفر اچانک کسی ایک لمحہ میں مکمل نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل فکری کشمکش، مذہب کے بارے میں سوالات، مغربی تہذیب سے بے اطمینانی، یہودیت اور عیسائیت کے مطالعہ، اسلام کے بارے میں ابتدائی شکوک اور بالآخر قرآن مجید کے پیغام سے گہری وابستگی کی ایک مسلسل داستان موجود ہے۔

مریم جمیلہ 1934ء میں نیویارک کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پیدائشی نام Margret Marcus تھا۔ بچپن ہی سے وہ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی مالک تھیں اور زندگی کے بنیادی سوالات پر غور کرتی تھیں مثلاً: خدا کیا ہے؟ انسان کیوں پیدا ہوا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا؟ کیا جدید تہذیب انسان کو واقعی خوشی اور سکون دے سکتی ہے؟!

جوانی میں پہنچ کر ان کی ذہنی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ جدید مغربی تہذیب کی ظاہری ترقی، سائنسی کامیابیوں اور مادی سہولتوں کے باوجود انہیں محسوس ہوتا تھا کہ انسان کے اندر ایک خلا موجود ہے۔ وہ سوچنے لگیں کہ اگر جدید تہذیب انسان کو حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ بنا چکی ہے تو پھر انسان اتنے بڑے پیمانے پر ظلم، جنگ اور تباہی کیوں پیدا کر رہا ہے؟

یہی سوال انہیں مختلف مذاہب کے مطالعہ کی طرف لے گیا۔

انہوں نے یہودیت کا مطالعہ کیا، عیسائیت کے بارے میں پڑھا اور مشرقی مذاہب کی طرف بھی توجہ کی لیکن ان کی تلاش ابھی کسی ایک مذہب پر آ کر نہیں رکتی تھی۔ وہ مذہب کو محض موروثی شناخت کے طور پر قبول کرنے کے بجائے عقل اور تجربہ کی روشنی میں سمجھنا چاہتی تھیں۔ ان کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی بات کو صرف اس لیے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں کہ معاشرہ اسے درست سمجھتا ہے، وہ خود پڑھتی تھیں، غور کرتی تھیں، سوال کرتی تھیں اور پھر نتیجے تک پہنچتی تھیں۔

اسلام کے بارے میں ان کی ابتدائی معلومات بہت محدود اور بعض اوقات غلط تصورات پر مبنی تھیں۔ اس لیے کہ انھوں نے سیکنڈ ہینڈ معلومات کی روشنی میں دیگر مذاہب کی طرح اسلام کو بھی ایک ایسے مذہب کے طور پر دیکھا تھا کہ وہ جدید زندگی سے ہم آہنگ نہیں لیکن ان کے اندر موجود حق کی تلاش نے انہیں اسلام کے بارے میں براہِ راست مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا۔

یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نہایت اہم مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں مختلف کتابیں اور مضامین پڑھنے شروع کیے۔ قرآن مجید کا مطالعہ بھی اسی جستجو کا حصہ بنا اور انہیں محسوس ہوا کہ قرآن انسان سے براہ راست خطاب کرتا ہے، اسے کائنات پر غور کرنے، اپنے وجود پر سوچنے، اخلاقی ذمہ داری محسوس کرنے اور اپنے خالق کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ خدا کے ایسے تصور کی تلاش میں تھیں جو محض فلسفیانہ بحث کا موضوع نہ ہو بلکہ انسانی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔ قرآن نے ان کے سامنے اللہ کا تصور ایک ایسے خالق کے طور پر پیش کیا جو واحد ہے، بے نیاز ہے، تمام کائنات کا مالک ہے، انسان کو پیدا کرنے والا ہے اور اس کے اعمال سے باخبر ہے۔ اس تصور نے ان کی فکری تلاش کو ایک نئی سمت دی۔

قرآن انسان کو نہ تو محض ایک حیوانی مخلوق سمجھتا ہے اور نہ اسے خدائی صفات کا حامل قرار دیتا ہے۔ وہ اسے اللہ کا بندہ، زمین پر ذمہ دار مخلوق اور اخلاقی انتخاب کی صلاحیت رکھنے والا انسان قرار دیتا ہے۔ مریم جمیلہ کے لیے یہ تصور نہایت اہم تھا، کیونکہ وہ ایک ایسی تہذیب میں رہ رہی تھیں جہاں انسان کی مادی آزادی تو بڑھ رہی تھی

لیکن روحانی مقصد اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

قرآن نے انہیں بتایا کہ انسانی زندگی کا مقصد صرف دنیاوی کامیابی نہیں بلکہ اللہ کی معرفت، عبادت، اخلاقی پاکیزگی اور آخرت کی جواب دہی بھی ہے۔ اس تصور نے ان کی زندگی کے بنیادی سوالات کو ایک مربوط جواب فراہم کیا۔

یہاں ایک نہایت اہم بات سمجھنے کی ہے کہ مریم جمیلہ کی قرآن سے دلچسپی کسی ایک ظاہری واقعہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کی طویل فکری تلاش کا منطقی نتیجہ تھی۔ قرآن ان کے لیے محض ایک مقدس کتاب نہیں رہا بلکہ ان سوالات کا جواب بننے لگا جنہیں وہ برسوں سے اپنے اندر لیے پھرتی تھیں۔ انہیں قرآن میں خدا، انسان، کائنات، اخلاق، زندگی، موت اور آخرت کے بارے میں ایک مربوط تصور ملا۔

قرآن کا اسلوب بھی ان کے لیے غیر معمولی کشش رکھتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ قرآن انسان کو محض معلومات نہیں دیتا بلکہ اس کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔ کبھی وہ کائنات کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، کبھی انسان کو اس کے اپنے وجود پر غور کرنے کو کہتا ہے، کبھی پچھلی قوموں کے واقعات بیان کرتا ہے اور کبھی قیامت کے دن انسان کی جواب دہی کا احساس دلاتا ہے۔ اس انداز خطاب نے ان کے اندر قرآن کے مزید مطالعے کی خواہش پیدا کی۔

انہوں نے قرآن کو صرف ترجمہ کے ذریعے سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسلام کے بنیادی ماخذ اور اسلامی تہذیب و فکر سے متعلق کتابیں بھی پڑھیں۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا، ان کے اندر یہ احساس مضبوط ہوتا گیا کہ اسلام مغرب میں رائج اس تصویر سے کہیں زیادہ وسیع، گہرا اور ہمہ گیر مذہب ہے جس سے وہ پہلے واقف تھیں۔ اسلام نے ان کے لیے عقل اور وحی، روحانیت اور عمل، فرد اور معاشرہ، حقوق اور ذمہ داری، دنیا اور آخرت کے درمیان ایک جامع توازن پیش کیا۔

قرآن سے پیدا ہونے والی یہی دلچسپی بعد میں ان کی عملی زندگی میں بھی ظاہر ہوئی۔ وہ اسلام کے بارے میں محض علمی معلومات حاصل کر کے مطمئن نہیں ہوئیں بلکہ اپنی زندگی کو بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان کی یہ تبدیلی تدریجی تھی۔ پہلے فکری قبولیت آئی پھر اسلامی تعلیمات سے قلبی وابستگی بڑھی اور آخر کار انہوں نے اسلام کو اپنے لیے زندگی کا مکمل راستہ تسلیم کر لیا۔

ان کے قبول اسلام کے سفر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں اور بعد میں ان سے ہونے والی خط و کتابت کا بھی اہم کردار رہا۔ مریم جمیلہ نے اسلامی فکر، مغربی تہذیب، جدیدیت، اخلاق اور مذہب کے موضوعات پر گہری دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں انہیں اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کے طور پر سمجھنے کا ایک ایسا منظّم انداز ملا جس نے ان کے ذہن کو مزید مطمئن کیا۔ بعد میں وہ پاکستان گئیں اور مولانا مودودیؒ کے خاندان کے ساتھ رہیں۔ وہیں انہوں نے اپنے علمی اور اسلامی سفر کو مزید آگے بڑھایا۔

مریم جمیلہ نے بعد میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں مغربی تہذیب اور اسلام کے تقابل، جدیدیت، مذہب، اخلاق اور اسلامی معاشرت کے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کی تحریروں کا بنیادی محرک بھی وہی فکری سوالات تھے جنھوں نے انہیں قرآن تک پہنچایا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام محض چند مذہبی رسومات کا نام نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی کو اللہ کی ہدایت کے تابع کرنے کا نام ہے۔

ان کے قرآن سے تعلق کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ انہوں نے اسلام کو اس کے اصل مصادر سے سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ صرف مسلمانوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بجائے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو بنیادی معیار بنانا چاہتی تھیں۔ یہ طرزِ فکر ان کی علمی دیانت کی علامت تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ کسی بھی مذہب کا جائزہ اس کے ماننے والوں کے انفرادی نقائص کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی اصل تعلیمات کی بنیاد پر لینا چاہیے۔

اسلام کی خوبی یہی ہے کہ جو شخص بھی سچے دل سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر دنیا کا ہر مذہب اس کی نگاہ میں بے معنی ہو جاتا ہے اور جب وہ اسلام میں قدم رکھ کر ایمان کی بلندیوں تک پہنچتا ہے تو غیر معمولی خدمت کا فرض بھی انجام دیتا ہے، صحابہ کرامؓ کے عہد سے لے کر آج تک اس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ مریم جمیلہ بھی اسی سلسلہ کی ایک زریں کڑی ہیں جن کے قلم نے اسلام کی خوب ترجمانی کی۔

الحاد کا طوفان - اسباب اور علاج

محمد نجم الدین الرحیمی ندوی

الحاد ولادینی کے اسباب اور وہ فکر ونظر جن سے اس کو تقویت اور مضبوطی حاصل ہوئی' مغرب کا مذہبی تصور ہے، قرون وسطیٰ میں عیسائی مذہب کی بالادستی اور چرچ کی گرفت نہایت مضبوطی سے قائم رہی، کلیسا کا اثر واقتدار اس قدر تھا اور پوپ کی پیشوائی اور اس کی طاقت واقتدار اتنی ٹھوس تھی کہ بڑے بڑے شاہوں کی قسمت کا فیصلہ چرچ میں پوپ کرتا تھا اور ایک طبقاتی نظام میں پورا مغرب جکڑا ہوا تھا، یہ ایسا دور تھا کہ اس میں پوپ کا مذہبی سربراہ کی حیثیت سے بادشاہ پر حکم چلتا تھا اور اس کے برخلاف پوپ بادشاہ کے حکم کا پابند نہیں تھا اور مذہبی کتابیں یا بائبل پڑھنا بھی منع تھا، صرف مذہبی لوگ ہی پڑھ سکتے تھے اور ہر وہ علم وفکر جس کا محور مذہب اور چرچ تھا، اس پر پابندی نہیں تھی اور جس کا سرچشمہ چرچ نہیں تھا' اس پر پابندی اور شجرۂ ممنوعہ کی مہر لگی ہوئی تھی، علم وفکر پر کلیسا کا یہ تسلط نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد بھی قائم رہا۔

ایک انگریز مصنف (Kenneth Neil Cameron) نے لکھا ہے:

”اٹھارہویں صدی عیسوی تک مغرب کی تمام درس گاہیں، کالج اور یونیورسٹیاں چرچ کے زیرنگرانی رہیں، کوئی فرد کسی درس گاہ میں یانجی طور پر چرچ کے لائسنس کے بغیر تعلیم نہیں دے سکتا تھا۔“

(Humanity & Society:227)

عیسائی دنیا میں ایک فکری انتشار ہوا اور اسی مذہبی بغاوت اور ذہنی وفکری انتشار کی چکی سے جدید دور کا آغاز ہوا اور اس کی روشنی نے بغاوت کی اور اسی دور میں مغربی استعمار اور سامراجیت (Imperialism) کا دور شروع ہوا، اب چرچ کا تسلط اور اس کا سیاسی اقتدار' میدان عمل میں ختم ہوا اور اسی دور میں مغرب اور یورپ میں مذہبی تعلیمات اور چرچ وگرجا گھروں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی لہر آئی۔

اس طرح سے مذہب وپاپائیت سے علم وفکر کی سخت جنگ ہوئی، چرچ نے علم وفکر کی مخالفت کی اور عقل انسانی کو علم ومعرفت کی روشنی سے محروم رکھنے کی برابر جدوجہد کی، ظلم وبربریت کی تاریخ عالم کے اوراق میں وہ داستان رقم کی کہ تاریخ انسانی کا سر شرم سے جھک کر رہ گیا، چرچ اور علم وفکر کے مابین اختلاف بڑھتا گیا یہاں تک کہ یورپ کے لوگوں میں یہ فکر پیدا ہونے لگی کہ مذہب علم کا دشمن اور معرفت وآگہی کا مخالف ہے، ظاہری طور پر یہ یقین ہو چلا کہ مذہب سائنس اور جدید علوم کا مقابلہ کر نہیں سکتا، یہ فکر اس لیے پیدا ہوئی کہ یورپ میں مذہب کو حریت فکر ونظر اور روشنی علم وہنر کا دشمن سمجھا گیا۔

اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بنی کہ مغرب میں جو مذہب کی نمائندگی اور اس کے نمائندے تھے وہی اس دشمنی کے سبب بنے اور مذہب اور علم وفکر کے درمیان میں ایسی خلیج حائل ہوئی کہ مذہب کو اس میں شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا اور علم وفکر اور جدید سائنس کو کامیابی حاصل ہوئی اور نئے نئے نظریے وجود پذیر ہوئے جس سے رفتہ رفتہ پوری دنیا اس کی گرفت میں چلی آئی۔ سامراجیت واستعمار کا دور بھی شروع ہوا، برصغیر پر بھی اس نے اپنا تسلط قائم کیا اور دیگر افریقی اور مشرق بعید کے ممالک تک سامراجیت نے پوری طرح اپنا جال بچھا دیا۔

جدید نظام تعلیم نے ارتداد اور الحاد ولادینی کو فروغ دینے کے تئیں ان مفروضہ نظریوں کا سہارا لیا کہ پوری دنیا میں لامذہبیت اور

الحادیت کا ایک نیا مذہب وفکر سامنے آ گیا۔عیسوی مذہب نے یورپ میں اوراس کے طول وعرض میں بقا کی جدوجہد کی لیکن اس کی قسمت کی لکیر نے کلیسا کے زوال کا فیصلہ کر دیا اور چرچ کا غلبہ جاتا رہا،فکر انسانی کی چرچ کی عائد کردہ پابندیاں پا'در ہوا ہوئیں، سترہویں صدی میں چرچ کو سیاست واقتدار سے جدا کر دیا گیا۔

(The Century of Revolution:181)

اس طرح عقلیت پسندی کا دور شروع ہوا، یہی یورپ کا شہرت پذیر اور مقبول نظریہ حیات بنا کر پیش کیا گیا اور مذہب پس منظر میں چلا گیا، بہرحال عیسائی دنیا میں جدت پسندی،عقلیت پسندی اور قدامت پسندی تینوں میدان فکر وعمل میں موجود ہیں اور اپنے دائرۂ اثر ورسوخ کی توسیع کی کوشش میں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں صدق وسچائی سے ہنوز دور ہیں، سچائی اور صدق وحقیقت کو پانے کے لیے اسلام کے دروازے تک آنا ناگزیر ہے جو انسانی دنیا کا واحد سچا مذہب ہے جو ہمہ گیر وعالم گیر اور کامل دین اور مکمل نظام حیات ہے۔

مذہب کے لادینیت اور الحاد کی طرف سفر میں جو اسباب ہیں ان میں جدید مغربی مفکرین اور فلاسفہ کا مذہب کا تصور صرف وہ مسیحیت ہے جو چرچ کے زیر سایہ اور پوپ کی پیشوائی میں پھلی پھولی، انہیں اسلام کی بالکل خبر نہیں کیوں کہ اسلام میں علم وفکر کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے اور ہر شعبہ ہائے زندگی پر محیط اور ہر ہر گوشہ کے تئیں روایتی، عقلی اور منطقی استدال اور متوازن قانون اپنے پاس رکھتا ہے۔

یورپ میں فکر ونظر اور علم وآگہی کی آزادی نے مذہب کا اعتبار ووقار گرادیا، اسی نے مذہب مخالف عنصر کو وجود بخشا، یہیں سے دہریت کی راہ ہموار ہوئی، خدا کو اختیارات سے محروم رکھا گیا، خدا کے فرستادہ کی ضرورت بے معنی ہو کر رہ گئی، صنعتی انقلاب کے عہد میں اقتصادی ترقی نے معاشرہ کو بے شمار مسائل ومشکلات سے دوچار کر دیا اوران کے حل کے لیے نئے معاشرتی نظام اور سیاسی تصور پیش ہوئے، مختلف افکار اور نئے رجحانوں نے راہ پانے کی کوشش کی مگر یہ سب بے معنی ہو کر رہ گئے، ان میں دو بڑے خطرناک رجحان وفکر ہیں؛

(۱) سیکولرزم (Secularism)

(۲) ماڈرن ازم (Moderenism)

یہ مسلم امہ کے اعتقادی، فکری ونظری اور عملی کردار کی بیخ کنی کر رہے ہیں اور الحاد اور لادینیت کے پودوں کو سیراب کر کے بڑا کر رہے ہیں، سیکولرزم سے سائنس اور فلسفہ نے اپنی شکست تسلیم کر لی، سیکولرزم نے سیاست ومعیشت اور معاشرتی خوبیوں کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا، گزشتہ ہفتوں میں ایک خبر زعفرانی گروہ کے سربراہ کی نشر ہوئی کہ ایل جی بی ٹی کمیونٹی کی حمایت کی اور اسے سماج کا حصہ قرار دیا، یہ سیکولرزم کی الحادی فکر کی آبیاری کا شاخسانہ ہے۔اب باقاعدہ یورپ وامریکہ ہی نہیں دیگر ممالک میں بھی اس کی تحریک جاری ہے جبکہ یہ مذہب کے سراسر خلاف اور الحاد ولادینیت ہے اور یہ سیکولرزم کا فیض ہے۔

سیکولرزم ایک نظام فکر وعمل ہے، اس نظام کی اساس ہی اس پر ہے کہ دین کو زندگی اور سیاست سے جدا کر دیا جائے، اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی تو یہ صاف طور پر معلوم ہے کہ مغرب میں تحریک اصلاح مذہب کے بعد وجود پذیر ہوا اور اس نے دین اور دنیا کو الگ خانوں میں بانٹ دیا، دنیا کے مذاہب نے سیکولرزم کو اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے مذاہب وادیان تغیر پذیر دنیا اور جیتی جاگتی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

مغرب کے اہل علم وقلم نے یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی ہے کہ اسلام کا حال بھی یہی ہے اور اس کے لیے اسلامی تعلیمات، شریعت اور تاریخ کو مسخ کرنے کا کام ہنوز جاری ہے مگر اسلام جامد مذہب نہیں، وہ زندہ، ہردم رواں اور ہردم جواں ہے، اس کے اندر تغیر پذیر انسانی دنیا کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے، تمام شعبہ ہائے زندگی میں پوری قانونی اور اخلاقی رہنمائی کا صحیفہ اس کے پاس محفوظ ہے، یہ جس طرح ماضی کا مذہب تھا، حال کا بھی ہے اور مستقبل کی امید بھی اسی اسلام کے سایہ میں آ کر حاصل ہوتی ہے کیوں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور دائمی اور کامل ترین دین ہے۔

ابتلاء وآزمائش میں اسوۂ نبوی ﷺ

محمد امین حسنی ندوی

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو آزمائش اور امتحان کی جگہ بنایا ہے، جزا اور بقا کی جگہ نہیں، یہاں انسان کو قدم قدم پر مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے؛ کبھی نعمت وآسائش کے ذریعہ، کبھی فقر وفاقہ اور تنگ دستی کے ذریعہ، کبھی صحت وعافیت کے ذریعہ اور کبھی بیماری وتکلیف میں مبتلا کرکے، کبھی خوشی ومسرت کے لمحات عطا کرکے اور کبھی غم واندوہ اور مصیبتوں سے دوچار کرکے۔ ان آزمائشوں کا مقصد یہ ہے کہ سچائی اور جھوٹ، ایمان اور نفاق، صبر اور ناشکری کے درمیان فرق نمایاں ہوجائے اور ہر شخص کے باطن کی حقیقت ظاہر ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لِيَمِيزَ اللَّهُ ...... هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (الأنفال: ۳۷) (تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے الگ کردے اور ناپاک چیزوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر ان کا ڈھیر بنادے پھر اسے جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔)

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ ...... الصَّابِرِينَ﴾ (اور ہم ضرور تمہیں کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادیجیے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿الم ☆ أَحَسِبَ النَّاسُ ...... الْكَاذِبِينَ﴾ (العنکبوت: ۱-۳) (الم؛ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، پس اللہ ضرور ان لوگوں کو ظاہر کردے گا جو سچے ہیں اور ان لوگوں کو بھی ظاہر کردے گا جو جھوٹے ہیں۔)

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ ابتلاء وآزمائش صالحین کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''لوگوں میں سب سے زیادہ سخت آزمائش کس کی ہوتی ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''انبیاء کی پھر ان لوگوں کی جو ان کے زیادہ قریب ہوں پھر جو ان کے زیادہ قریب ہوں۔ انسان کو اس کے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے؛ اگر اس کا دین مضبوط ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کے دین میں کمزوری ہو تو اسے اسی کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ چنانچہ آزمائش بندے کے ساتھ مسلسل رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔'' (ابن حبان)

چنانچہ بندہ جتنا اپنے رب کے قریب ہوتا ہے، اتنا ہی اس کی زندگی میں آزمائشوں کا حصہ بڑھتا جاتا ہے۔ تاہم یہ آزمائشیں محض تکلیف اور اذیت کا نام نہیں بلکہ ربانی تربیت کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ انہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درجات بلند فرماتا ہے، ان کے گناہوں کو مٹاتا ہے، ان کے ایمان کو جلا بخشتا ہے اور انہیں صبر، توکل، رضا اور اپنے قرب کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور اللہ کے نیک بندوں کی زندگیوں میں آزمائشوں کے مقابلے میں صبر واستقامت کی ایسی روشن مثالیں ملتی ہیں جو رہتی دنیا تک اہل ایمان کے لیے مشعل راہ بنی رہیں گی۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو بیماری، مال ودولت اور اہل وعیال کے فقدان کے ذریعہ سخت آزمائش میں مبتلا کیا گیا مگر مصیبتوں کے طویل سلسلے نے ان کے عزم کو متزلزل نہ کیا اور تکلیفوں کے طوفان ان کے دل سے امید کا چراغ نہ بجھا سکے۔ انہوں نے اپنے رب کے حضور نہایت ادب، عاجزی اور محبت کے ساتھ عرض کیا:

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ (الأنبياء: ۸۳) (اے میرے رب! مجھے تکلیف پہنچ گئی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔)

یہ پکار بارگاہِ رحمت تک پہنچی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، ان کی تکلیف دور کردی اور ان کی حالت کو دوبارہ خوش حالی سے بدل دیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ...... لِلْعَابِدِينَ﴾ (الأنبياء: ۸۴) (پھر ہم نے ان کی دعا سن لی اور ان کی سب تکلیف دور کردی اور ان کے گھر والے انھیں دے دیئے اور ان کے ساتھ اتنا ہی اور دیا اپنی

خاص رحمت سے اور تا کہ عبادت گزاروں کے لیے نصیحت رہے۔)

اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے محبوب فرزند حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم برسوں اپنے سینے میں لیے رکھا۔ آنکھیں اشک بار رہیں، دل غم سے نڈھال رہا، یہاں تک کہ مسلسل گریہ کرتے کرتے ان کی بینائی بھی متاثر ہوگئی مگر زبان پر شکوہ نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾(یوسف: ۱۸) (پس صبر ہی بہتر ہے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جاسکتی ہے۔)

بالآخر صبر واستقامت کی یہ طویل داستان وصال اور خوشی پر منتج ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والد کی آغوش میں واپس پہنچا دیا۔ یوں برسوں کے غم کے بعد جدائی کی رات ختم ہوئی اور وصال کی صبح طلوع ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ صبر واستقامت کے بے مثال پیکر تھے۔ اگر صبر واستقامت اور ثبات کا پیکر مجسم دیکھنا ہو تو سیرت محمد عربی ﷺ سے بڑھ کر کوئی پیکر نہیں ہوسکتا۔

آپ ﷺ نے دعوتِ حق کی راہ میں ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں جن کے تصور سے بھی دل کانپ اٹھتا ہے لیکن آپ ﷺ کے پایہ ثبات میں کبھی جنبش نہ ہوئی اور نہ ہی آپ ﷺ کے ماتھے پر کبھی شکن نمودار ہوئی اور نہ ہی اپنے مشن سے ایک لمحے کے لیے پیچھے ہٹنا آپ ﷺ نے گوارا کیا۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ بیت اللہ میں نماز ادا فرما رہے تھے، سجدہ میں تھے کہ ایک مشرک عقبہ بن ابی معیط اونٹ کی اوجھڑی لا کر آپ ﷺ کی پشت مبارک پر ڈال دیتا ہے، بوجھ کی شدت کے باعث آپ ﷺ اپنا سر مبارک نہ اٹھا سکے۔ ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نماز میں مشغول تھے تو اسی بدبخت نے آپ ﷺ کا گلا مبارک سختی سے دبانے کی کوشش کی مگر ظلم وستم کی یہ آندھیاں اس پہاڑ کو نہ ہلا سکیں جسے اللہ تعالیٰ نے رسالت، یقین اور صبر واستقامت کی قوت عطا فرمائی تھی۔

آپ ﷺ نے بچپن ہی میں والدہ کی جدائی کا صدمہ برداشت کیا پھر دادا کی وفات کا غم سہا اور جوانی میں اپنے شفیق چچا حضرت ابوطالب اور وفادار رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا دکھ برداشت کیا۔ زندگی کے آخری دور میں اپنے صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کی جدائی کے صدمات بھی برداشت کیے لیکن ہر مرحلے پر صبر، رضا، توکل اور اللہ سے تعلق کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔

غزوات اور دعوتی جدوجہد کے دوران بھی آپ ﷺ کو بے شمار تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ پوچھا: ''یارسول اللہ! کیا آپ کی زندگی میں اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن آیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تمہاری قوم کی طرف سے بہت کچھ برداشت کرنا پڑا لیکن سب سے سخت دن طائف کا دن تھا، جب میں نے طائف کے سرداروں کے سامنے دعوتِ حق پیش کی مگر انہوں نے نہ صرف دعوت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ انتہائی سنگ دلانہ سلوک کیا۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو میں دونوں پہاڑوں کو ان پر ملا دوں لیکن رحمت عالم ﷺ کی زبان مبارک سے انتقام کے بجائے امید کے الفاظ نکلے، فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

یہی وہ مقام ہے جہاں آزمائش انسان کی شخصیت کو بلندی عطا کرتی ہے، جہاں مظلوم انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود رحمت کو اختیار کرتا ہے، جہاں زخم نفرت کو جنم دینے کے بجائے دل میں خیر خواہی کا چشمہ جاری کر دیتے ہیں اور جہاں ظلم سہنے والا اپنے دشمن کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ پس آزمائش مومن کے لیے محض ایک مشکل مرحلہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تربیتی سفر ہے۔ یہ انسان کے ایمان کو پرکھتی، اس کے کردار کو نکھارتی اور اس کے باطن کو سنوارتی ہے۔ کامیاب وہ نہیں جس کی زندگی آزمائشوں سے خالی ہو بلکہ کامیاب وہ ہے جو آزمائش کے ہر مرحلہ میں ایمان کو تھامے رکھے، صبر کا دامن نہ چھوڑے، اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرے اور حالات کے اندھیروں میں بھی اس کی رحمت سے امید وابستہ رکھے۔

امین حرم

محمد مصعب ندوی

مکہ کی سنگلاخ وادیوں میں گھمسان کی جنگ چھڑنے والی ہے، فضا سوگوار ہے، ہر طرف ہلچل مچی ہوئی ہے، قریش کے مختلف قبائل نے بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، پتھر اٹھائے جارہے تھے، دیواریں بلند ہورہی تھیں اور مکہ کے سینے میں ایک مقدس عمارت تعمیر ہورہی تھی، وہی عمارت جس کو ہمارے اور آپ کے سردار ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، اس عمارت کی تعمیر ہوئے ایک لمبا عرصہ گزر چکا تھا، گردش لیل ونہار نے اس کی دیواروں کو کمزور کردیا تھا، چھت گر چکی تھی، اب قریش والے اس مقدس عمارت کو پھر سے تعمیر کررہے ہیں، ہر قبیلہ عزت وشرف حاصل کرنے کے لیے اس کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہے، مگر تعمیر ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ایک بڑا مسئلہ درپیش آ گیا، وہ تھا حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا، یہی وہ مرحلہ تھا جس کا انتظار سب کررہے تھے مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ یہی لمحہ سارے مکہ کو خون کے دریا کے قریب لاکر کھڑا کردے گا، ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ حجر اسود کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار میں نصب کرنے کا شرف اسے ملے۔

یہ صرف ایک پتھر رکھنے کی بات نہ تھی، یہ شرف تھا، یہ قبائلی عزت تھی، یہ آنے والی نسلوں کے لیے فخر کا عنوان تھا، چنانچہ بنوعبد الدار نے کہا: ”یہ حق ہمارا ہے!“ بنوعدی بھی پیچھے نہ رہے، دوسرے قبائل نے بھی اپنا حق جتانا شروع کردیا۔

بات بڑھتی گئی، آوازیں بلند ہوئیں، چہرے سرخ ہونے لگے، تلواریں میان سے باہر آنے کو بے تاب ہونے لگیں، قریش کے بڑے بڑے سردار ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے، مکہ کی فضا میں خطرے کی بو پھیل گئی ہے۔

ایک پتھر رکھنے کا مسئلہ ہے مگر اب سوال یہ ہے کہ پتھر کون رکھے گا؟ اور اگر فیصلہ نہ ہوا تو جنگ ہی فیصلہ کرسکتی ہے، جنگ کرنا' خون میں نہانا مکہ والوں کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے، وہ تو معمولی معمولی باتوں پر لڑتے ہیں، سالہا سال تک لڑا کرتے ہیں، مستقل دشمنی برقرار رکھنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے، کسی کا اونٹ پہلے پانی پی لے، کسی کا گھوڑا آگے نکل جائے، ان باتوں پر لڑنے والی قوم اتنے بڑے شرف کو کیسے بغیر جنگ کے چھوڑ سکتی ہے؟!

کہا جاتا ہے کہ قریش کے قبائل اس موقع پر جنگ میں کٹ مرنے پر عہد کرنے لگے، ایک قبیلہ تو خون کا پیالہ لے کر آیا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اس بات کا عزم کیا کہ وہ اپنے حق سے پیچھے نہیں ہٹے گا، مکہ کی سرزمین نے بہت سے معرکے دیکھے تھے مگر یہ عجیب معرکہ ہے، جنگ کسی زمین، سلطنت یا دولت کے لیے نہیں ہے، ایک مقدس پتھر کو رکھنے کے شرف کے لیے ہے، چار دن گزر گئے ہیں، پانچواں دن آ گیا ہے مگر اختلاف ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ کچھ عقلمند اور دانشور لوگ اس حالت کو دیکھ کر فکرمند ہوا ٹھے، گزشتہ جنگوں نے مکہ والوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور یہ جنگ مکہ کی تاریخ میں سب سے بڑی اور خوف ناک جنگ ہوگی، سارا مکہ خون میں ڈوب جائے گا۔

آخر کار ایک بزرگ نے جن کا نام ابوامیہ بن مغیرہ مخزومی تھا، ایک ایسی تجویز پیش کی جس نے سب کو ایک لمحہ کے لیے خاموش کردیا، انہوں نے کہا:

”اے قریش! اپنے اختلاف کا فیصلہ اس شخص سے کراؤ جو سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے تمہارے پاس داخل ہو۔“

سب نے یہ بات مان لی۔ اب فیصلہ انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر تقدیر کے سپرد ہوگیا تھا، سب کی نگاہیں مسجد کے دروازے کی طرف جم گئیں، وقت گزر رہا ہے، خاموشی گہری ہوتی جارہی ہے، ہر شخص سوچ رہا ہے؛ کون آئے گا؟ کون اس جھگڑے کا فیصلہ کرے گا؟ کون یہ طے کرے گا کہ حجر اسود کس قبیلے کے ہاتھوں اٹھے گا؟!

اچانک — دور سے ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے، نگاہیں اس

طرف اٹھیں اور پھر ایک ہی لمحہ میں سارا مجمع پکارنے لگا:''یہ محمد ہیں!'' کسی نے کہا:''یہ تو امین ہیں!''اور سب ایک زبان ہوکر کہنے لگے: ''ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں!''

وہ محمد بن عبداللہ ﷺ تھے، وہی محمد ﷺ جنہیں مکہ نے نبوت سے پہلے ہی صادق اور امین تسلیم کرلیا تھا، کیا عجیب منظر تھا! چند لمحے پہلے تک قریش کے قبائل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اب سب کی امیدیں ایک ہی شخص سے وابستہ ہوگئیں تھی۔

آپ ﷺ نے لوگوں کے چہروں کو غور سے دیکھا اور پھر آپ ﷺ نے صورتِ حال کو سمجھ کر ایسا فیصلہ فرمایا جس نے تاریخ کو بھی حیران کردیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:''ایک چادر لاؤ۔'' چادر لائی گئی، آپ ﷺ نے اسے زمین پر بچھایا پھر حجر اسود کو اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھایا اور چادر کے وسط میں رکھ دیا، اب آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر قبیلے کا سردار چادر کا ایک ایک کنارہ پکڑ لے۔''

قبائل کے سردار آگے بڑھے۔ وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے، اب ایک ہی چادر کے ارد گرد کھڑے تھے، چادر بلند ہوئی۔ حجر اسود بلند ہوا، ہر قبیلے کے ہاتھ میں اس مقدس شرف کا حصہ آ گیا اور جب حجر اسود کعبہ کی دیوار کے برابر پہنچ گیا تو — محمد ﷺ نے اسے اپنے دست مبارک سے اٹھایا اور اس کو اس کے مقام پر رکھ دیا۔

بس! اتنا سا فیصلہ مگر اس فیصلے نے ایک ایسی جنگ روک دی جس کا انجام بہت برا ہونے والا تھا، نہ بنو عبدالدار کی عزت گئی، نہ دوسرے قبائل کی، نہ کسی کو شکست ہوئی، نہ کسی کو ذلت، سب شریک ہوگئے اور دنیا کے سب سے بڑے حکیم و دانا شخص نے حکیمانہ فیصلہ کر دیا، اپنی حکمت و دانشوری سے ایک بڑی جنگ ٹال دی۔ آپ ﷺ نے صرف حجر اسود کو اس کے مقام پر نہیں رکھا تھا بلکہ آپ ﷺ نے تلواروں کے درمیان صلح کرادی تھی۔ خاندانی عصبیت، قبائل غرور، کبر و نخوت کے بیچ انصاف رکھ دیا تھا۔

ذرا اس منظر کو دھیان میں لائیے، ایک طرف قریش کے بڑے بڑے سردار، قبائلی غرور، بجلی کی طرح کوندرہی تلواریں، آنکھوں میں غصہ، دوسری طرف ایک ایسا شخص جس کے پاس نہ بادشاہی تھی' نہ لشکر، نہ حکومت مگر مکہ کے دلوں پر اس کی امانت کا ایسا اقتدار تھا کہ سب نے ایک زبان ہوکر کہا:''یہ محمد ہیں...... یہ امین ہیں!''

اور اس دن مکہ نے پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا کہ ایک انسان بغیر تاج کے بادشاہوں سے زیادہ باوقار، بغیر لشکر کے لشکروں سے زیادہ طاقتور اور بغیر کسی حکومت کے دلوں پر حکومت کررہا ہے۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ابھی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ ابھی نبوت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ ابھی قرآن کی ایک آیت بھی نازل نہیں ہوئی تھی لیکن محمد ﷺ کی سچائی، امانت اور حکمت نے مکہ کے دلوں میں اپنا مقام بنالیا تھا۔

اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کے فیصلے پر قریش نے سر تسلیم کیا، مشکل وقت میں جن کو اپنا حکم بنایا، جن کو وہ صادق اور امین کہتے تھے جب اس نے اپنی نبوت کا اعلان کیا، توحید کی صدا بلند کی تو یہی قریش اس کے جانی دشمن ہوگئے، اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے لگے اور پھر وہ وقت بھی آیا' فلک گواہ ہے، تاریخ قلمبند کرتی ہے کہ جس نے نبوت سے پہلے انہیں اپنی حکمت و دانائی سے جھگڑے سے باہر نکالا تھا، ہر خاندان کو عزت دی تھی، سب کو ایک ہی چادر کے ارد گرد جمع کردیا تھا، اسی نبی نے نبوت کے بعد عرب کے منتشر قبائل کو کلمہ توحید کے ارد گرد جمع کردیا، ان کے اندر رحم، اخوت ومحبت پیدا کردی، ان کو توحید کا پرستار بنادیا، ذرات کو ماہ وانجم کردیا۔

آپ سیرت کا مطالعہ کیجیے تو سارے عالم کا سب سے عظیم سب سے با اثر، سب سے زیادہ عدل و انصاف کرنے والا، سب سے زیادہ حکیم و دانا شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پائیں گے، یہی وہ ذات ہے جس کی زندگی کا ہر گوشہ ساری دنیا کے لیے، کیا عرب کیا عجم، کیا ہندو کیا مسلم، کیا یہودی کیا نصرانی، سب کے لیے مشعل راہ ہے، بس کوئی روشنی حاصل کرنے والا ہو۔

رسول اللہ ﷺ اور انسان سازی کا فن

محمد ارمغان بدایونی ندوی

تاریخ وسیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے قبل دنیائے انسانیت پوری طرح خودکشی پر آمادہ تھی، جاہلی نخوت، قبائلی تعصب، انتقام کا جذبہ، طاقت کا نشہ، کمزوروں کا استحصال، غلاموں پر ظلم اور اخلاقی انتشار اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا، نہ خونی رشتوں کا تقدس تھا اور نہ ہی اقرباء پروری کا خیال، پوری کی پوری قومیں شراب، جوا، سٹا اور پانسے جیسی نجس چیزوں کی رسیا تھیں، خاص طور پر وہ سرزمین مکہ جہاں آخری نبیؐ کو مبعوث ہونا تھا' اگر وہاں پانچ قلم بھی تلاش کیے جاتے تو شاید ملنا مشکل تھے، گویا ان کے نقطہ زوال کی یہ آخری حد تھی۔

نبی رحمت ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس متعفن سماج کی اصلاح کے لیے وہی طریقہ اپنایا جو انبیاء علیہم السلام کا امتیاز رہا ہے، انھوں نے حکومتوں اور تنظیموں کی طرح لمبے چوڑے دستور اور قوانین وضع نہیں کیے، عسکری قوت کو مضبوط کرنے کی جدوجہد نہیں کی، قانون ساز اسمبلیاں تشکیل نہیں دیں، مجرموں اور رہزنوں کی سرکوبی کے لیے چوکیاں نہیں بنائیں، علم کی شمع کو فروزاں کرنے سے قبل کسی دانش گاہ کی بنیاد نہیں ڈالی اور آلات ووسائل سے محروم دنیا کو مادی سوغات سے نہیں نوازا بلکہ آپ ﷺ نے سب سے پہلے اس "انسان" کو اپنا موضوع بنایا جو خدا فراموشی کی پاداش میں خود فراموشی کی سزا بھگت رہا تھا، آپ ﷺ نے انسان کی بے مقصد زندگی کو ایک رخ عطا کیا، اس کے اندر صحیح یقین پیدا کیا، اس کی نیک خواہشات اور اعلیٰ صلاحیتوں اور بلند اخلاق وکردار کو تعمیری سمت دی۔

آپ ﷺ نے تعمیر انسانیت کے باب میں عقیدۂ توحید کو بنیاد بنایا اور اس کے ذریعہ انسانیت کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دیا، اس کے اندر اعتماد کی صفت پیدا کی اور اسے یہ باور کرایا کہ وہ اس دنیا میں کسی بھی طاقت کا تابع وغلام نہیں بلکہ یہ پوری کائنات اس کی خادم ہے اور وہ اس دنیا میں صرف اپنے خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا پابند ہے۔ یہ وہ بنیاد تھی جس نے انسانیت کو عز وشرف کی انتہائی بلندیاں عطا کیں، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دی اور اسے ایک کھلی فضا میں آزادانہ سانس لینے کا موقع نصیب ہوا۔

نبی اکرم ﷺ نے اس بنیاد پر انسانیت کو مجتمع کرنے کے بعد لوگوں کی فطری خوبیوں اور ذاتی اوصاف وکمالات کو ایک صالح مقصد عطا کیا تا کہ انسان کی انرجی تخریب کے بجائے تعمیر انسانیت کے کاموں میں خرچ ہو، آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ

"الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام إذا فقهوا."(صحيح البخاري)

(لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح مختلف طبائع وصلاحیتوں کے حامل ہیں، جو لوگ جاہلیت میں اپنے اوصاف وخوبیوں کے اعتبار سے بہتر تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وہ بہتر ہی رہتے ہیں، جب کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرلیں۔)

اس تفصیل کی روشنی میں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا سرسری جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس صحابی میں طبعی طور پر جو خصوصیت پائی جاتی تھی آپ ﷺ نے اس کو ختم کرنے کے بجائے ایک صحیح رخ عطا کر دیا پھر چشم ظاہر نے اس کے غیر معمولی نتائج کا مشاہدہ کیا مثلاً: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نرمی اور علم الانساب میں ان کی مہارت، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جرأت وبے باکی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حیا وجذبہ سخاوت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت ودلیری، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا جنگی جوہر،

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا شاعرانہ مزاج۔

آپ ﷺ کے انداز تربیت میں یہ بات خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے کہ آپ براہِ راست کسی فرد کو ہدفِ ملامت نہیں بناتے تھے بلکہ اس کے اندر اس برائی کی نفرت پیدا فرماتے تھے جس کا وہ شکار ہوا اور اس کے ضمیر کو بیدار کرتے تھے، اگر کوئی غلط بات دیکھتے تو ایسے نرم اسلوب میں اصلاح فرماتے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اسی لیے عام طور پر کسی کا نام لیے بغیر اصلاح کا عمومی انداز اختیار فرماتے۔

آپ ﷺ کی افراد سازی کا ایک ہنر یہ بھی تھا کہ آپ اپنے ہر صحابی پر اعتماد کرتے اور اس کے ساتھ غیر معمولی محبت کا اظہار فرماتے، اسی طرح اگر کسی کا کوئی اچھا عمل نظر آتا تو اس کی کھل کر ہمت افزائی بھی فرماتے۔ اس طرح تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں فدائیت کا ایک جذبہ پیدا ہوا جس نے پوری دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

آپ ﷺ کے اس انداز تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے وہ بدو جن کی قیمت اس وقت کی متمدن دنیا کی نگاہوں میں کچھ نہ تھی بلکہ ان کی حیثیت صرف اونٹوں کی گلہ بانی کی تھی، آپ ﷺ کی نگاہِ کیمیا اثر نے انھیں عالم کی گلہ بانی کا شرف عطا فرمایا اور چند ہی برس میں انھوں نے پوری دنیا کو علم و فضل اور انسانیت سے مالا مال کر دیا۔

حقیقت میں یہ وہ صالح انسانی سماج تھا جو دنیا کے منظر نامہ پر نبوی تربیت کا شاہکار بن کر ابھرا، اس کے پاس جدید ترین وسائل یا آلاتِ حرب اور صنعت و حرفت کا وہ وسیع نظام نہیں تھا جس پر ترقی یافتہ قوموں کو ناز ہوتا ہے تاہم اس کے پاس وہ صالح اور تعمیری مقاصد ضرور تھے جن کے ذریعہ تسخیر عالم بلکہ تسخیر کائنات کا فرض ادا کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر شعبہ زندگی میں اپنی اہلیت و صلاحیت اور اپنی فرض شناسی و احساس ذمہ داری کا بہترین ثبوت پیش کیا۔

فیضان نبوت سے سیراب یہ فرد جب اقوام عالم کی حکمرانی پر مامور ہوا تو اقرباء پروری، ظلم، بدعنوانی، تعیش پسندی اور غفلت کے بجائے اس نے عدل و انصاف، مساواتِ انسانی، ایثار و قربانی اور احساس ذمہ داری کی ایسی محیر العقول مثالیں پیش کیں جن کی نظیر دنیائے انسانیت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی فرد جب تجارت کے میدان میں قدم رنجاں ہوا تو اس نے امانت داری، صاف گوئی اور خیر خواہی کا ایسا نمونہ پیش کیا جو دنیا کی دوسری قوموں کے لیے ایک قابل تقلید اسوہ تھا۔ یہی فرد جب عائلی اور خانگی زندگی میں پہنچا تو اس نے محبت و مودت اور ہر ایک کے حقوق کی ادائیگی میں مثال قائم کر دی۔

مدرسہ نبوت کا تربیت یافتہ یہ شاہکار فرد اپنے اندر ایسی تاثیر رکھتا تھا کہ اس نے بعد کی صدیوں میں بھی ایسے قیمتی جواہر پیدا کیے جن کے اندر انسانیت و اخلاق، خدا شناسی اور انسان دوستی کا مزاج تھا اور ان کی زندگیاں اسوۂ حسنہ ﷺ کا پرتو معلوم ہوتی تھیں۔

افسوس کی بات ہے کہ صنعتی انقلاب کے اس دور میں آج ہمیں اس لازوال مدرسہ نبوت کے چشمہ صافی سے سیراب وہ فضلاء اور تربیت یافتہ نظر نہیں آتے جن کی نگاہیں مادیت کی زرق برق سے خیرہ نہ ہوں، جن کے اندر خدا ترسی و خدا طلبی اور انسان دوستی کا ذوق ہو، جن کے اندر ذرائع اور مقاصد کے درمیان تمیز کا شعور ہو، آج کے اس مشینی دور میں ہمیں ایک ایسا انسانی سماج نظر آتا ہے جو ایمان و یقین کی دولت سے خالی، انسانی ضمیر سے عاری، خلوص و محبت کے تقاضوں سے نا آشنا اور انسانیت کے شرف و احترام سے تہی دامن ہے، نہ اس کے اندر خالق حقیقی کی معرفت کا جذبہ ہے اور نہ ہی امانت داری کا احساس پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ انسان انسانیت کی بھنور میں پھنسی کشتی کو ساحل مراد سے ہم کنار کر سکے؟! سچ تو یہ ہے کہ امن و انسانیت کے علم برداران جدید دور میں فکری قیادت کرنے اور انسانی معاشرہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ہر محاذ پر بری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا آج بھی اسی در کی محتاج ہے جس نے اسے ایک مثالی فرد دیا، انسانیت کا درد اور زخم کا مرہم دیا اور وہ بنیادیں فراہم کیں جن پر انسانیت کی فلک بوس عمارت تعمیر کی جا سکے۔

ملفوظات داعی اسلام

حضرت مولانا عبید اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ضبط وپیش کش:

محمد عظیم الدین ندوی

دو اہم چیزیں:

فرمایا: ’’دو چیزوں سے رفعت حاصل ہوتی ہے اور انسان خدا تعالیٰ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے؛ خدمت اور مشقت یعنی آدمی اللہ والوں کی خدمت کرے پھر اس خدمت میں جو مشقت ہو اُسے بھی برداشت کرے اور سارے اعمال میں صرف اللہ کی رضا مقصود رکھے۔‘‘

اخلاص کی برکت:

فرمایا: ’’اگر کسی صاحب ایمان کے ہر عمل میں اخلاص شامل حال ہو تو اس کے تمام اعمال باعث نجات و رفعت ہوں گے۔ اخلاص کی بنا پر کیا جانے والا تھوڑا سا عمل بھی بہت زیادہ مؤثر، نفع بخش اور ترقی کا باعث ہوتا ہے۔‘‘

اخلاص کی علامت:

فرمایا: ’’کامل اخلاص کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کی برائی کی جائے یا پھر اس کی تعریف کی جائے تو اس پر کوئی خاص اثر نہ پڑے۔ اس لیے کہ اگر آدمی میں اخلاص ہوگا اور جب اس کی برائی کی جائے گی تو وہ یہ سوچے گا کہ میں تو اس کے کہنے سے زیادہ برا ہوں پھر اس کی طبیعت پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا، اسی طرح جب اس کی تعریف کی جائے گی تو وہ سوچے گا کہ یہ سب تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے پھر وہ اترائے گا نہیں۔‘‘

طہارت کے فوائد:

فرمایا: ’’شریعت مطہرہ میں طہارت کا خاص طور پر حکم ہے اور اس کو نصف ایمان بتایا گیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ طہارت کے غیر معمولی فوائد ہیں اور یہ انسانی طبیعت کا ایک بنیادی تقاضا بھی ہے۔ اگر آدمی روحانی طور پر بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے طہارت کا ہونا ضروری ہے، جب طہارت ہوتی ہے تو غیر معمولی عروج حاصل ہوتا ہے اور عبادات میں دل لگتا ہے۔‘‘

اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

فرمایا: ’’سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی راہ میں غیر معمولی مشقتیں برداشت کیں، یہاں تک کہ اپنا محبوب وطن بھی چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے نہایت حکمت و مصلحت کے ساتھ دنیاوی اسباب کو بھی اختیار کیا تاکہ امت مسلمہ کو ایک نمونہ مل سکے کہ اسی طرح ہمت و صبر اور توکل علی اللہ کے ساتھ دین کے کام میں لگے رہنا ہے۔‘‘

دو راستے:

فرمایا: ’’اس امت کے سامنے دو راستے بیان کیے گئے ہیں؛ ایک ہدیٰ (سراپا ہدایت) اور دوسرے ہویٰ (سراپا ضلالت۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم صاحب ہدیٰ تھے، صاحب ہویٰ نہیں تھے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (اور وہ خواہش سے نہیں کہتے وہ تو صرف وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی اسی ہدیٰ (سراپا ہدایت) کے راستہ پر چل کر محبوب الٰہی بننے کی کوشش کریں۔‘‘

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 18 ⚜ September 2026 ⚜ Issue: 09

سید احمد شہید اکیڈمی کی پیشکش

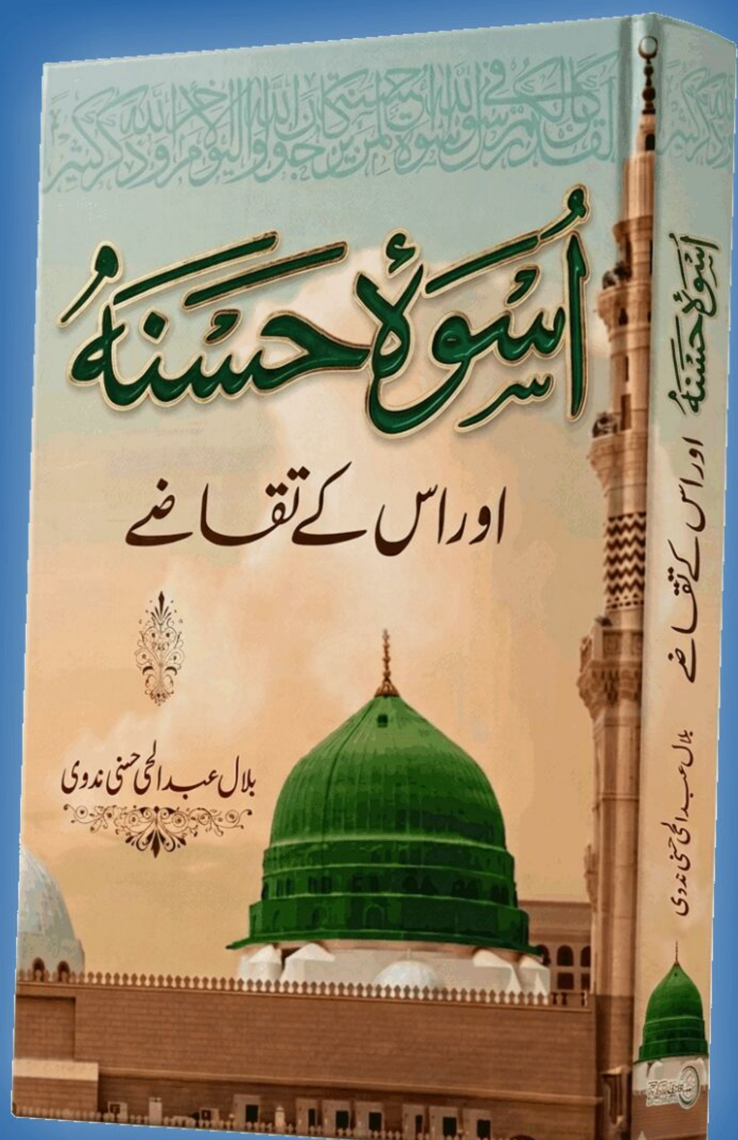

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)